Journal of Religion & Society **(JR&S)**
Available Online:
https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index
Print ISSN: 3006-1296Online ISSN: 3006-130X
Platform & Workflow by: Open Journal Systems
https://doi.org/10.5281/zenodo.21738974

A Concise Critical Review of Hali Studies in the Muslim World

عالم اسلام میں حالی شناسی-ایک اجمالی محاکمہ

Prof. Dr. Imtiaz Hussain Baloch
Chairman, Department of Urdu,
University of Southern Punjab, Multan
imtiazhussain@usp.edu.pk
Hashim Sher Khan
Advocate, District Bar, Dera Ghazi Khan
hashimsherkhan777@gmail.com
Naina Zahra*
Ph.d Scholar in Urdu at University of Southern Punjab Multan
***Corresponding Author**: lamashhadbloch@gmail.com

***Abstract**:*
This research examines the literary, intellectual, and reformative contributions of Maulana Altaf Hussain Hali with particular emphasis on his poetry, prose, biography writing, and critical thought. It explores Hali's role in the socio-cultural awakening of Indian Muslims during the nineteenth century under the influence of Sir Syed Ahmad Khan and the Aligarh Movement. The study highlights Hali's masterpiece Musaddas-e-Madd-o-Jazr-e-Islam as a landmark reformist poem that inspired moral, educational, and social consciousness among Muslims. It also analyzes his major prose works, including Hayat-e-Saadi, Yadgar-e-Ghalib, and Hayat-e-Javed, demonstrating his pioneering contribution to Urdu biography, literary criticism, and historical writing. Furthermore, the paper discusses Hali's simple yet effective literary style, his commitment to realism, and his efforts to promote educational, ethical, and national reform through literature. The study concludes that Hali occupies a central position in modern Urdu literature as a reformer, critic, biographer, and poet whose literary legacy continues to influence Urdu scholarship and intellectual discourse.
Keywords: *Aligarh Movement, Musaddas: The Ebb and Flow of Islam, Biography Writing, Hali Studies, Social Reform, The Life of Saadi, Memorial of Ghalib, The Everlasting Life, Literary Criticism, Reform of Muslims, Modern Urdu Literature, National Awakening*

مولانا الطاف حسین حالی(ولادت 1837ءپانی پت_ وفات: یکم جنوری 1915ءپانی پت) ہندوستان کی شاعری اور نثری تصانیف کی قدر و قیمت کا تعین ماضی میں ہو سکا، نہ عہدِ رواں میں اور نہ ہی فرداکیا جاسکے گا۔ ہمارے اردو ادب میں ان گنت ایسے شاعر و ادیب بھی ہو گزرے ہیں، جن کی تخلیقات و نگارشات اپنے اپنے عہد کی ترجمانی کرتی رہی ہیں، مگر اب وہ قصۂ پارینہ بن کر ایک آثار کے طور پر تاریخ و ادب میں گردانی جاتی ہیں، جنہیں سدا بہار فن و ادب سے تشبیہہ نہیں دے سکتے۔ مبتدائے فیض نے اردو ادب کو معدودے چند ایسے شاعر و ادیب، محقق و مورخ اور فلاسفر دیے ہیں، جن کا فن ہر دور کی ضرورت بانگِ درا، نقارہ خلق اور زندہ رُود ثابت ہوا، نجانے کتنی فردا نامعلوم نسلیں ان کے علم و ادب، تحقیق و فلسفہ، ایجادات اور دیگر، سائنسی فنون سے استفادہ واحاطہ اور اثر و نفوذ پیدا کرتی رہیں گی۔

مولانا حالی انیسویں صدی کی ایسی ہمہ جہت، قد آور اور بے مثل علمی و ادبی ہستی ہو گزری ہیں، کہ جن کی زندگی کا مقصد، محور اور مدعا سر سید احمد خان(ولادت: 17 اکتوبر 1817ء___ وفات: 27مارچ 1898ء مدفن، علی گڑھ) کی طرح یہ رہا کہ سوچ و فکر، قلمے، سخنے مسلمانوں کو ان کی موجودہ پستی اور ذلت کا احساس دلایا جائے، اور ان کے اذہان و عملی روشوں کو مغربی غلامی سے آزادی دلائی جائے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی یہ بھی حقیقی کوشش راسخ رہی کہ مسلمانوں کے علم و ادب اور اسلامی روایات و افکار اور علمی و ادبی وغیرہ شخصیات کو تحریر و واعظ سے دنیا میں روشناس کرایا جائے۔ اور وہ سر سید کی طرح اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی انقلاب انگیز اور اپچ نگار شاعری سے لوگوں کے دلوں کو تڑپا کے رکھ دیا اور ان میں اصلاح و احوال کا صور دم دے کر ایسا پھونکا کہ پوری قوم کو تڑپ اٹھی، نثر سے زیادہ ان کی شاعری

کارگر اور قند ثابت ہوئی، یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی (ولادت: 1857ء قصبہ بندول ضلع اعظم گڑھ یو-پی–وفات: 1914ء) کو سرسید احمد خان کے دو اجزا قرار دیے تھے۔ اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> "سرسید مرحوم کے لائحہ عمل کے دو اجزا تھے، اول یہ کہ مسلمانوں کو ان کی موجودہ ذلت کا احساس دلایا جائے، یہ کام حالی نے کیا۔ دوم یہ کہ اُن کے سامنے ان کی گزشتہ عظمت کے واقعات دہرائے جائیں، تاکہ ان میں ترقی کا جوش پیدا ہو، یہ فرض شبلی نے انجام دیا۔"(۱)

سچی بات بھی یہی ہے کہ انیسویں صدی کے آخری رُبع صدی کے دوران حالی اور شبلی سیرت و سوانح نگاری اور شخصیت شناسی کی شان دار روایت کے واحد سرخیل ثابت ہوئے۔ بقول خاصے:-

"حالی اور شبلی نے جس اعلیٰ پائے کی تحقیق، فکری اُپج کاری اور معیاری نثری اسلوب کا جو لوہا منوایا ہے، اُس سے بہتر تو دور کی بات، ان جیسا تحقیقی، تنقیدی و فکری کام آج تک کسی سے بھی نہ ہو سکا، اور نہ ہی فردا اِس بات کی پیشن گوئی یا شہادت دی جا سکتی ہے۔"

1857ء کے ادھورے انقلاب کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوئی کہ ہندوستان اب سیاسی طور پر اس نہج پر نہیں رہا کہ وہ دنیا کی ایسی ترقی یافتہ اور روشن خیال قوم کا سامنا کر سکے، جو علم و دانش، سائنس، حکمت، صنعت و حرفت اور دیگر جدید فنون میں سب سے آگے اور بہتر ہیں۔ یہاں مقابلہ اور مناقشہ مشرقی اور مغربی اقوام کے مابین ہی نہ تھا، بل کہ بے علم، بے عمل اور جہالت میں ڈوبی ہوئی بے شعور اقوام کا اہلِ علم، خالصاً عمل دار اور انتہا کی ترقی یافتہ قوم سے تھا۔ یہ مقابلہ اُس قوم سے تھا، جن کی حکمرانی سو سے زائد ممالک پر مقبوضہ تھی اور جن کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں مشرقی اقوام کو مغربی قوم کے آگے سیاسی و سماجی اکھاڑے میں اپنی کم زور بساط لپیٹنی پڑی۔ ہندوستانی مشرقی اقوام یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ سیاسی و سماجی طور پر تو اُن کا جنازہ اٹھ گیا، مبادا ہمیں ثقافت، تہذیب، روایات، معاش اور اپنے اپنے مذاہب میں بھی تبدل و تنزل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اِس سوچ و فکر کا فائدہ یہ ہوا کہ دِل شکستہ اور قنوطیت کی شکار اقوام میں اصلاح واحوال کی فضا قائم ہونے لگی، سرسید احمد خان، راجہ موہن رائے اور سوامی دیانند سرسوتی وغیرہ نے آگے بڑھ کر اپنی اپنی قوم کو انفرادی واجتماعی طور پہ اکٹھا کر کے ایک تحریک کے طور پر کوششیں کیں۔ حالی بھی اس ہندوستانی معاشرے کا حصہ تھے، وہ بھی اِس تحریک سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ غدر 1857ء کی آڑ میں صلیبی جذبہ اپنا کام کر رہا تھا۔ جس سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیے۔ اِس ناکردہ لذت گناہ کے طفیل سامراجی مصلحتیں ایک سازش کے تحت صرف مسلمانوں کو ہی انتقام کا نشانہ بنا کر صلیبیوں نے ہلالیوں کو نو سو سالہ اقتدار سے الگ کیا۔ انہیں جلاوطن کیا گیا، موروثی جائیدادیں بحق سرکار ضبط کی گئیں، سینکڑوں اہل علم، علماء اور اہل ثروت ممتاز شخصیات کو سرِعام پھانسیاں دی گئیں اور پابند سلاسل کیا گیا، لال قلعے کے شہزادوں کے سر تن سے جدا کیا گیا۔ پورا ہندوستان مسلمانوں کے لیے مقتل گاہ بنا رہا۔ معاشی و تعلیمی دروازے بند کر دیے گئے۔ مسلمان انتہائی کسمپرسی کے عالم میں چلے گئے۔ دوسری طرف ہندو بڑی عیاری سے انگریز سامراج کا ساتھ دے رہے تھے اور انہی کے تعاون اور مدد سے زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ترقی اور کامیابی کے جھنڈے گاڑھ رہے تھے۔ مولانا حالی نے سرسید کی تحریک پر قلمے اور سخنے اپنا کردار موثر طور پر ادا کرنا شروع کر دیا۔ اُن کا مقصد ناامیدی اور بے شعوری میں گھری ہوئی اپنی قوم کی ذہنی، روحانی اور علمی چارہ سازی تھا، جن کا عملی ثبوت ان کی اصلاحی و قومی غزلوں، نظموں، مثنویوں اور نثری تحریروں میں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ اقتدار پر شبِ خون مارنے سے یہ ضرور ہوا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی تہذیب، ثقافت، روایات اور زبان سے آشنا ہونا شروع کر دیا، جو آگے چل کر دو قومی نظریے کا موجب بنی۔ اس تحریک اور جدوجہد کی مدت گو بہت طویل تھی، مگر آخر مسلمانانِ ہند میں ایک علاحدہ خطہ، ایک علاحدہ زبان اور ایک علاحدہ تہذیب سے آشنائی کا احساس ضرور ابھرا۔ ہمارے ترقی پسند اہل علم یورپی شاعری کے چند بڑی قومی نظموں، جن میں فرانسیسی نظم "سانگ آف رولینڈ" سوکی نظم "یروشلم لبراٹا" اسپینی نظم "پوئیماڈل مینوسڈ" پرتگالی نظم "لوسی ایڈ" ملٹن کی نظم "پیراڈائیز لاسٹ" یونانی نظم "ایلئیڈ"، "ورجل کی نظم"، ای ئیڈ" وغیرہ کے مقابلے میں مسدس کو کم درجے کی نظم گردانتے ہیں، حالاں کہ جس طرح یورپ اور ہندوستان کی تہذیب، مذاہب، قومیت، زبان، بود و باش، مسائل، سیاسی و عسکری رجحانات، حالات و واقعات اور فنون و ادب وغیرہ میں زمین و آسمان کا سا تفاوت ہے، اِسی پیرائے میں مسدس اور یورپین نظمیں تخلیق کی گئی ہیں، جن کے درمیان موازنہ کسی بھی صورت میں نہیں کیا جا سکتا۔ مسدس میں جو سادہ یا سلیس زبان یا لفظوں کا اظہار و برتاؤ ملتا ہے، وہ ہندوستانی اقوام کی شعوری علامت اور تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ یورپین نظموں میں تشبیہات اور استعارات وغیرہ کا جو سہارا لیا گیا ہے، اور خوب صورت لفظوں کی جو بنت کاری کی گئی ہے۔ اُس کا عشر عشیر مسدس میں نہیں ملتا، اگر مولانا حالی مسدس میں یہی لفاظی کرتے ہوئے کورانہ تقلید کرتے، تو ہندوستانی اقوام، جو جہالت اور بے شعوری میں سانسیں لے رہے تھے، کس طرح مسدس کے پیغام اور جزئیات کو سمجھ پاسکتے تھے اور اسے قبول کر سکتے تھے۔ صلیبی جنگوں میں اگر مسلمان اور عیسائی مدِ مقابل تھے، تو دونوں میں سے ایک بھی نہتہ نہیں تھا۔ اُس

عہد (غدر 1857ء) میں ہندوستانی مسلمان نہتے تھے، وہ کس طرح جدید اسلحے سے لیس اور عسکری تربیت یافتوں سے میدانِ کارزار میں مقابل ہو سکتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو تو رزم شناسی سے آگاہی ہی نہیں تھی۔ ناگزیر تھا کہ ہندوستانی اقوام کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جائے، انہیں بے شعوری سے شعور، بے کاری سے تجارت اور فنون و تعلیم کی طرف رغبت اور تنزل سے ترقی وغیرہ کی طرف راغب کیا جائے۔ مسدس لکھنے کا بنیادی ماخذ اور مقصد بھی یہی تھا۔ یہ سر تا پا اصلاحی اور تہذیبی نظم کہلاتی ہے۔ جیلانی کامران مسدس سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:-

> "مسدس حالی اِس لحاظ سے مسلمانوں کے دور جدید کی سب سے بڑی نظم ہے، کیوں کہ یہ نظم ایک طرف اسلام کو تہذیبی تصور کے طور پر پیش کرتی ہے، تو دوسری طرف اسلام کو ایک تہذیب کے نام سے موسوم بھی کرتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نظم کے ساتھ مسلمانوں کی تہذیب اور مغربی تہذیب کے مابین جو رشتہ اور رابطہ قائم ہوتا ہے، اُس پر اس برعظیم کی پچھلے برسوں کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ اِس اعتبار سے مسدس حالی کا مرتبہ وہی ہے، جو ایلئیڈ، سانگ آف رولینڈ، پوئیماڈل مینوسڈ، یروشلیم لبراٹا اور لوسی ایڈ کا ہے۔ فرق محض انداز بیان کا ہے، باقی سب اجزا عظمت کی حد تک برابر ہیں۔"(۲)

مولانا الطاف حسین حالی کی علمی و ادبی، مذہبی اٹھان، سوچ و فکر اور عمل و کردار کو دیکھتے ہوئے سر سید احمد خان نے حالی کی حینِ حیات میں جو تحسینی و تعریفی کلمات کہے اور لکھے ہیں، وہ ہماری اردو کی علمی و ادبی تاریخ میں کسی بھی قد آور شخصیت سے متعلق صفحۂ قرطاس پر پڑھنے کو نہیں ملتے۔ اِس حوالے سے سر سید کے بڑے فرزند سر راس مسعود اپنے ایک یادداشتی مضمون میں رقم طراز ہیں کہ:-

> "رات کا وقت ہے، کھانے کی میز لگی ہوئی ہے۔ ایک سرے پر میرے دادا مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی داہنی جانب مولانا الطاف حسین مرحوم اور بائیں طرف میرے والد، قومی معاملات پر پُرجوش گفت گو ہو رہی ہے۔ چند لمحوں کے لیے باتیں بند ہوتی ہیں اور میرے والد کے منہ سے یہ فقرہ نکلتا ہے۔ "ابا جانی! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے، اُن میں سے کون ایسا ہے، جس کی پرستش کرنے کے لیے تیرا دِل تیار ہو جائے، تو میرے پاس جواب حاضر ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے۔"(۳)

مولانا الطاف حسین حالی نثر میں بھی باکمال تھے، جن کے معترف سر سید احمد خان جیسی نابغۂ روزگار بھی تھی۔ انہوں نے حالی کی مایہ ناز مسدس "مد و جزر اسلام" (1879ء) کو فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دیا تھا، جس طرح ہر دو شاعر میں شاعرانہ تعلیٰ کا عروج اور اثر و نفوذ کا غلبہ ہوتا ہے، مولانا حالی اس مبالغاتی اور بناوٹی تخیل و فکر سے سر تا پا آزاد، مبرا اور کوسوں تھے۔ یہ اُن پر مبداۓ فیض تھا، جس سے قدرت نے کام لیا ہے۔ مولانا حالی کو سر سید اپنے ایک مکتوب محررہ 10 جون 1879ء میں انہیں تحسینی و توصیفی انداز میں یوں لکھتے ہیں کہ:-

> "جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا؟ میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔۔۔"(۴)

سر سید مسدس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اُن کی شدید خواہش تھی کہ اس کا مطالعہ ہر خاص و عام کرے اور اس کے مندرجات اور پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے ایک قریبی جلیس سے اِس اَمر کا اظہار تک کر دیا تھا کہ:-

> "اگرچہ میں طبعاً ناچ رنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا اور اصولاً اُسے مُضر سمجھتا ہوں، لیکن اگر طوائفیں اپنی محفل میں مسدس گا کر سنائیں تو میں ان میں نہ صرف خود شرکت کروں گا، بل کہ اپنے احباب سے بھی شرکت کے لیے کہوں گا۔"(۵)

اگر ہم دونوں ممتاز ہستیوں کی عمر کے فرق کو ملاحظہ کریں، تو معلوم ہو جائے گا کہ مولانا حالی سے سر سید بیس سال بڑے تھے، اِس کے باوجود بھی سر سید عقلی اور فطری طور پر مولانا حالی کے علم و رتبے کے بڑے معترف تھے، وہ بھی اس وقت سے جب مولانا حالی کی اٹھان تھی۔ ہمارے اردو ادب میں صرف مولانا حالی اور علامہ اقبال کی اُس عہد میں ان کی علمیت اور اُن کے فن کی بڑی پذیرائی اور قدر و منزلت ہوتی رہی، جب دونوں کا آتش جواں تھا۔ ایک غلطی کی بروقت درستی اور تصحیح ناگزیر ہے، تاکہ یہ روایت اور تحقیق غلط راہ اختیار نہ کر جائے۔ اس حوالے سے اصغر عباس اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:-

"جسٹس سید محمود اپنے والد سر سید سے کہتے ہیں کہ ابا جانی!! اگرچہ خدا مجھ سے یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے، اُن میں سے کون ایسا ہے، جس کی پرستش کرنے کے لیے میرا دِل تیار ہو جائے، تو میرے پاس جواب حاضر ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے۔"(۶)

حالاں کہ یہ الفاظ سر سید نے اُس نشست میں اپنے والد سے کہے تھے، جس میں مولانا حالی اور سر سید کے صاحب زادے سر راس مسعود بھی موجود تھے۔ سر راس مسعود اس وقت بچے تھے، مگر وہ اپنے والد کے یہ تحسینی کلمات توجہ اور غور سے سن رہے تھے، جس کا اظہار سر سید کے فرزند سر راس مسعود نے اپنے ایک مضمون "خواجہ حالی کی دو تصویریں" کے عنوان میں واضح طور پر کر دیا تھا۔ اِس اقتباس کو قندِ مکرر کے طور پر لکھا جارہا ہے۔

"رات کا وقت ہے، کھانے کی میز لگی ہوئی ہے۔ ایک سرے پر میرے دادا مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں، اور ان کی داہنی جانب مولانا الطاف حسین مرحوم اور بائیں طرف میرے والد، قومی معاملات پر پُر جوش گفت گو ہو رہی ہے۔ چند لمحوں کے لیے باتیں بند ہوتی ہیں، اور میرے والد کے منہ سے یہ فقرہ نکلتا ہے۔ "ابا جانی!! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے، ان میں سے کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لیے تیرا دِل تیار ہو جائے، تو میرے پاس جواب حاضر ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالی ہے۔"(۷)

سر راس مسعود اپنے مضمون میں اِس تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید بیانی ہیں کہ:-

"میں دُور کھڑا ہوا اِس فقرے کو سنتا ہوں، اور مجھ کو اکیلا کھڑا ہوا دیکھ کر میرے والد اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے قریب آ جاؤں، اور پھر حکم دیتے ہیں جا الطاف حسین صاحب کے پاس کھڑا ہو جا۔ میں اِس حکم کو بجا لاتا ہوں۔ الطاف حسین حالی صاحب کمال شفقت سے مجھے سینے سے لگاتے اور پیار کرتے ہیں۔ اس وقت میری عمر سات سال کی ہے۔ اس کے بعد میں زنانے میں اپنی والدہ کے پاس جاتا ہوں، اور ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ کون صاحب ہیں، جن کی پرستش کرنے کے لیے میرے والد صاحب تیار ہیں، اور جنھوں نے مجھے پیار کیا ہے۔ اِس سوال کا جواب مجھے ملتا ہے، اُس سے پہلی دفعہ مولانا مرحوم کی عظمت کا بیج میرے دِل میں بویا جاتا ہے، اور جب کبھی میں اُن کو دیکھتا ہوں تو اپنے دِل میں کہتا ہوں کہ یہ انسان نہیں فرشتہ ہیں، باوجود اس کے اب میری عمر تقریباً پچاس سال ہو گئی ہے، میرے دِل میں وہی عظمت اُن کی ہے، اور وہی محبت اُن سے قائم ہے، جو بچپن میں تھی۔"(۸)

سر راس مسعود لکھتے ہیں کہ اُس وقت ان کی عمر سات برس تھی، بھلا سات برس کا بچہ اتنی بڑی بات کو اپنے بزرگوں کے درمیان مولانا حالی سے متعلق کیسے بیان کر سکتا ہے، جب کہ وہ مولانا حالی کو ٹھیک طریقے سے جانتے بھی نہیں تھے، نہ ہی اُن کی علمی وادبی اور مذہبی قد کاٹھ کا انہیں کوئی ادراک تھا۔ اصغر عباس نے اپنے مضمون میں دوسری بڑی سہواً غلطی یہ کی ہے کہ اِس نجی محفل میں موجود سر سید کے فرزند کا نام غلط طور پر جسٹس سید محمود لکھا ہے۔

سر سید احمد خان کے کہنے پر ہی مولانا نے شہرہ آفاق اور لازوال "مسدس" نظم کی تھی، جو اُن کی شاہکار پہچان بن گئی، جس نے ہندوستانی اقوام خصوصاً مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں پر گہرے نقش ثبت کیے ہیں۔ مسدس ہی کی وجہ سے مولانا حالی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، اگر اِس بے مثل نظم کو اردو شعری روایت سے نکال دیا جائے تو اردو شعر وادب میں کیا بچے گا۔ اس جیسی عمدہ تبلیغی شاعرانہ مثال ہمارے اردو ادبیات میں ہر حوالے سے ناپید ہے۔ مسلمانوں کی حالتِ زار اور اپنی اِس نظم سے متعلق مولانا حالی خود فرماتے ہیں کہ:-

"قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے، جس میں آ کر وہ اپنے خط وخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔"(۹)

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی مسدس سے متعلق رقم طراز ہیں کہ:-

"اپنی اثر انگیز تحریروں اور اپنی لازوال "مسدس" کے ذریعہ جو خدمت اور اعانت مولانا نے سر سید کی اتنی کسی اور سے بن نہ آئی۔"(۱۰)

وہ مزید آگے لکھتے ہیں کہ:-

"اگر حالی نہ ہوتے تو سرسید کو مسلمانوں کی اصلاح کے کام میں اتنی شان دار ترقی حاصل نہ ہوتی، جو ہوئی۔"(۱۱)

دنیائے اردو ادب میں نثر کی ابتدا کا تعین ممکنات میں سے نہیں، البتہ اس کی ابتدا انیسوی صدی کے ابتدا میں ہی ہو چکی تھی۔ 1857ء کے انتشار کے کافی سالوں بعد نثری کتب، مضامین اور مکتوبات وغیرہ تواتر سے لکھے جانے لگے، جسے ہم علمی و ادبی، فنی اور صحافتی نثر کی باقاعدہ آغاز کہیں گے۔ جنگِ آزادی کی شروعات مسلمانوں کے ارادوں اور ہاتھوں سے نہیں ہوئی تھی۔ سرسید احمد خان اپنے ایک مکتوب میں سمندر کو کوزے میں بند کر کے حق اور سچ بات کہی تھی، جو انہوں نے بدرالدین طیب جی کو لکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دِل چلے تھے، وہ بیچ میں کود پڑے ، ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے، ویسے ہی ہو گئے، مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"(۱۲)

غاصب انگریزوں نے اِسے مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال کر ان کی زندگیوں، مال و اسباب، علم و فن، عزت و ناموس، تہذیب و تمدن، دین، زبان، تجارت اور نو سو سالہ اسلامی سلطنت پر ناجائز قبضہ کر کے تارو پود ہلا کر رکھ دیے تھے۔ اِس غدر کے دوران در جنوں مقتدر شخصیات اور علماء کرام کو سرِ عام پھانسیاں دی گئیں۔ سینکڑوں کو سخت سزائیں دے کر جیلوں میں ڈال دیا گیا، بھاری بھر کم جرمانے اور جائیدادیں قرقی کی گئیں، لال قلعہ کے شہزادوں کے سر قلم کیے گئے، شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا، جہاں انہوں نے کسمپرسی کی حالت میں وفات پائی، (تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد دنیائے اسلام کے ہمارے ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے رنگون جا کر ان کی قبر تلاش کی اور اپنے گرہ سے ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کروایا۔) ہزاروں لوگوں کی وراثتی جائیدادیں اور کاروبار کو بحق سرکار ضبط کیا گیا، مسلمانوں پر نوکریوں اور تعلیم کے دروازے بند کیے گئے۔ عبادات اور دیگر بنیادی حقوق وغیرہ پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ یہ دور مسلمانوں کے لیے قیامت خیز منظر پیش کر رہا تھا، جس سے مسلمانوں کی بے بسی، بے کسی، تباہی و بربادی اور یاس و حسرت کی سچی دکھ بھری داستان نے جنم لیا، جب کہ انگریزوں اور ہندوؤں کا مکروہ چہرہ عیاں ہوا۔

یوں تو اردو شاعری اٹھارویں صدی سے ہی منظر نامہ پر آنا شروع ہوئی تھی، مگر اس نے سماج میں کوئی انقلاب برپا کیا تھا نہ ہی بالعموم ہندوستانی اقوام بالخصوص مسلمانوں کے شعور و اذہان کی کوئی آب یاری کر سکی تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اردو شعر و ادب میں اپنی انقلاب انگیز مسدس لکھ کر اس زمانے میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ سر سید احمد خان واحد ایسی ہستی تھے، جو یقیناً مقتدر انگریز حلقوں کے قریب ضرور تھے، مگر انہوں نے ایک تحریک کے طور پر اپنے غیر معمولی تدبر، دُور اندیشی، اخلاص اور پختہ ارادوں سے میدانِ عمل میں اترے، اور اپنے حلقے میں پسے اور ڈرے ہوئے مسلمانوں کے بہی خواہوں اور ہم خیالوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر لی، جنہوں نے خلوصِ نیت اور ہمہ قسمی قربانیوں سے مسلمانوں کو ترقی اور شعور کے راستے پر گامزن کر دیا۔ یہ ایک ایسی بیداری، بے لوث قربانیوں اور احساس کی گرم سر دلہر تھی، جس نے مسلمانوں میں دو قومی نظریے کا بیج بویا، جو آگے چل کر ایک علاحدہ وطن کے حصول پر منتج ہوئی۔

مولانا الطاف حسین حالی کے کام اور نام کو نثر کی بجائے اپنی فکر انگیز مسدس کے طفیل بام عروج حاصل ہوا۔ انہوں نے یہ مسدس سرسید احمد خان کی ترغیب پر لکھی تھی۔ حالی اپنی خود نوشت میں رقم طراز ہیں کہ:

"سرسید احمد خان مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کا حال اگر نظم میں بیان کیا جائے تو مفید ہو گا، چناں چہ میں نے اول مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں، لکھیں۔"(۱۳)

مولانا حالی نے ان گنت نثری کتب لکھیں بعض ترتیب دیں، بے شمار مضامین، کتب کے لیے دیباچے اور تقریظیں وغیرہ تحریر کیں، مگر کوئی ایک بھی کتاب یا نثری پارہ نچلی سطح کے عوام میں مسدس جیسی شہرت اور پذیرائی حاصل نہ کر سکا۔ اُن کی پہلی نثری کاوش ہی مذہبی شعور میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ:

"نظم کے سوا نثر اردو میں بھی میں نے چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلا غالباً 1867ء میں ایک کتاب "تریاق مسموم" ایک نیٹو کرسچئین کی کتاب کے جواب میں، جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا، لکھی تھی، جس کو اُس زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔"(۱۴)

تفصیل کے ساتھ "تریاق مسموم" کے حوالے ناپید ہیں، اور نہ ہی اس پر کوئی خاطر خواہ تبصرہ وغیرہ ملتا ہے۔ اُن کی دوسری کتاب "مولود شریف" بھی مذہبی نوعیت کی ہی تھی۔ یہ کتاب اور اس کا مسالہ بھی ہنوز ناپید ہے، حتیٰ کہ محولہ بالا دونوں کتب کی صحیح تاریخ اشاعت، تعداد صفحات وغیرہ کا تذکرہ بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا، تاہم

مولانا حالی نے اپنی خود نوشت میں مختصراً اس کا تذکرہ کیا ہے۔ صرف مولود شریف سے متعلق اتنا پڑھنے کو ملتا ہے کہ یہ کتاب مولانا حالی نے 1864ء تا 1869ء تک کے درمیانی عرصے میں تحریر کی تھی، جس کی اشاعت کا اہتمام مولانا حالی کی وفات کے بعد ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین (ولادت 1861ء) نے 1923ء میں کیا تھا۔ گورنمنٹ ڈپو لاہور میں جب اُن کا تقرر نائب مترجم ہوا، اس دوران "علم طبعات الارض" کو انہوں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی، جس کا عربی میں ترجمہ مصر کے ایک عالم نے کیا تھا۔ اِس کتاب سے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں کہ:

"لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اردو میں ترجمہ کیا اور کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا، چناں چہ ڈاکٹر لائٹز کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا، مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس، ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی تھی، جب کہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا، دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی، اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔"(۱۵)

1871ء سے 1872ء کے دوران ایک مجمل کتابچہ "شواہد الہام" تحریر کیا تھا، جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں عقلی و نقلی دلائل وثبوت سے نبوت اور الہام وغیرہ کی ضرورت کو ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ کتابچہ بھی معدوم ہے، البتہ 2015ء کو شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے مجلہ "تعبیر" کے شمارہ اول میں یہ شائع ہو گیا ہے۔ مولانا حالی نے تعلیم نسواں پر دو حصوں پر مشتمل ایک کتاب "مجالس النسا" کے نام سے سادہ انداز نگارش میں قلم بند کی تھی۔ اِس کتاب کا حصہ اول مطبع محمدی لاہور سے طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اِس کوشش پر کرنل ہالرائڈ نے ایجوکیشنل دربار دہلی میں لارڈ نارتھ کے ہاتھوں سے چار سو روپے کا انعام 1875ء میں دلوایا تھا۔ انعام ملنے کا تذکرہ مولانا حالی نے اپنی خود نوشت میں بھی کیا ہے۔ اِس کتاب کا دوسرا حصہ 1875ء میں محکمہ تعلیم نے مطبع سرکاری لاہور سے طبع کروا کر شائع کر دیا تھا۔ مولانا حالی نے سفر نامہ ناصر خسرو مرتب کیا تھا، جس پر انہوں نے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا تھا، جو مطبع اخبار خیر خواہ ہند دہلی سے طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ انہوں نے "مبادی علم جیالوجی" کے نام سے بوبہ نیرہ (Boubee Neree) کی فرانسیسی کتاب کے احمد آفندی فائد کے عربی ترجمے موسوم بہ اقوال مرضیہ فی علم بنیہ الکرۃ (1878ء) کا اردو زبان میں ترجمہ کیا تھا، وہ اُس وقت اینگلو عربک سکول دہلی میں پڑھاتے تھے۔ نثری حوالے سے حالی کے مکتوبات کو بھی اگر شامل کر لیا جائے، تو اُن کا نثری کام کافی وسعت اختیار کر جاتا ہے۔ اُن کے یہ خطوط "مکتوباتِ حالی" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اِسی طرح 1902ء میں حالی کے بکھرے ہوئے مضامین کو اکٹھا کر کے المعارف کے ایڈیٹر سید وحید الدین سلیم نے مرتب کے طور پر "مضامین حالی" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا تھا، جس میں اُن کے بتیس مضامین شامل ہیں۔ اِن مضامین میں مذہب، سیاست، ادب، فلسفہ، تعلیم اور دوسرے علوم و سماجی مسائل وغیرہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

حالی نے بالترتیب تین سوانح عمریاں لکھی تھیں، جن میں حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید ہیں۔ اُن کی علمی و ادبی اور تنقیدی نثر نگاری کا آغاز "حیات سعدی" لکھ کر ہوتا ہے۔ سب نقاد اِس بات پر متفق ہیں کہ "حیات سعدی" لکھ کر اردو زبان میں سوانح نگاری کی بنیاد رکھی۔ مولانا حالی سے بیشتر بھی لکھے جانے والے مختلف تذکروں میں سوانح نگاری کے نشان کچھ نہ کچھ (محدود پیمانے پر) ملتے ضرور ہیں۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کے مطابق:

"سوانحی اعتبار سے اس زمانے کا قابل ذکر سرمایہ تذکروں سے ہی عبارت ہے۔۔۔۔۔"(۱۶)

یہ اور بات ہے کہ حالی نے سوانح نگاری میں تحقیق و تنقید کو بے پناہ وسعت دے کر جدید نہج پر ممتاز اور سلیقہ آور کر دیا۔ "حیات سعدی" 1886ء میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ سب سے پہلے اس کا فارسی ترجمہ سید نصر اللہ سروش نے کر کے تہران سے کتاب متعارف کروادی تھی۔ اِس کتاب سے متعلق حالی مختصراً لکھتے ہیں کہ:

"دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم پر ریویو لکھ کر شائع کیا، جس کا نام "حیات سعدی" ہے۔ جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔"(۱۷)

خواجہ الطاف حسین حالی نے "حیات سعدی" میں جہاں سعدی شیرازی کی حیات اور ان کے ادبی و فنی محاسن پر جو اعلیٰ تحقیق و تنقید کی ہے، اُس کی مثال تو یورپین مصنفین میں بھی نہیں ملتی، جو انہوں نے سعدی پر تحقیقی و تنقیدی زاویوں کو آشکار کیا ہوا ہے۔ یورپین مصنفین نے بعض مقامات پر متنازعہ بحث کر کے سعدی کی بلند شخصی درجات کو پراگندہ کر دیا ہے، جو ان کے کمال تعصب پر دلالت کرتا ہے، مگر یہ کوئی تعجب انگیز رویہ نہیں ہے، ہر محکوم قوم کے ہیروز کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اِس گنگا میں ہمارے باشعور اور صاحب ادراک اہلِ دانش بھی اپنے ہاتھ دھوتے رہے ہیں، جن میں مولانا حالی بھی پتہ نہیں کس طرح شامل ہو گئے اور ان کا اثر قبول کر لیا۔ حالی "حیات سعدی" میں لکھتے ہیں کہ:

"گلستان اور بوستان سے ثابت ہوتا ہے، وہ ہر فرقے اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور ان کی صحبت سے فائدہ حاصل کرتا تھا، جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا، اسی طرح امرا کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتا تھا اور کبھی وہ احرار اور ابرار کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا اور کبھی اوباش والواط کے جلسوں کا تماشائی تھا، نہ اس کو شراب خانے میں عار تھا، نہ بت خانے میں رہنے سے ننگ تھا۔ اسی نے جامع بعلبک میں مدتوں وعظ کہا تھا اور وہی بت خانہ میں ایک مدت تک پجاری رہا۔"(۱۸)

سعدی کی شہرہ آفاق کتب بوستان اور گلستان کی بنیاد حکایات پر ہے۔ ہماری تہذیبی اقدار میں حکایات (امثال) بیان کرکے ہی کم سمجھ قاری یا سامع کو سمجھایا، بتایا اور راستہ دکھایا جاتا ہے۔ اِن حکایات کا زیادہ تر تعلق حقائق سے نہیں ہوتا، ایسی حکایات شاعرانہ تعلیٰ کے زمرے میں لی جاتی ہیں نہ ہی یہ سماج میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔ اِس خوب صورت طرز ادا اور پیغام کو یورپ کے بعض مصنف اور اُن کے مقلد نہ سمجھ سکے، اور یوں مولانا حالی تک بھی حکایات کو حق وسچ مان کر ہمیشہ کے لیے تنقیصی میدان چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ اپنے ایک مضمون میں بیانی ہیں کہ:

"سعدی کے اکثر جدید تذکرہ نگاروں نے بوستان اور گلستان کی حکایات کو مصنف کی سرگزشت کا جزو سمجھ کر ان کو بعض بیانات کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اِسی خیال کے ماتحت یورپ کے بعض مصنفین سعدی کے اِخلاق اور کیریکٹر کے متعلق ناگوار خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس قاعدہ پر عمل کرنے میں ہمارے تذکرہ نگار حالی بھی دوسروں کے ساتھ شریک ہیں اور بظاہر اس اصول پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے بہت سی مشکلات میں پھنس گئے ہیں۔۔۔ سومنات میں سعدی کا پجاری بن کر رہنا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس واقعہ میں بہت سی خلافِ واقعہ صورتیں جمع ہوگئی ہیں۔"(۱۹)

حالی نے سعدی کی تحقیقات میں بعض معاملات میں یورپین محققین کی اغلاط کی نشان دہی کرکے ان کی تصحیح بھی کی ہے، ان میں خاص کر سرگور اوسلی، دتاسی اور چیمبرز انسائیکلوپیڈیا کے مرتب شامل ہیں۔ چیمبرز کا یہ بیان کہ سعدی یورپ میں بھی گیا تھا، اِسی طرح دتاسی نے تو اتنا تک لکھ چھوڑا ہے کہ سعدی ہندوستانی (ریختہ) کے شاعر بھی تھے۔ مولانا شبلی جب شعر العجم لکھ رہے تھے، تو انہوں نے "حیات سعدی" کے منظر نامے پر آجانے کے بعد سعدی کے تذکرے سے اجتناب برتنا چاہا۔ اُن کا خیال تھا کہ "حیات سعدی" کے بعد ان پر کوئی اور مضمون لکھنا بے کار ہوگا۔ شبلی کے مکاتیب میں بھی اس چیز کا ادراک ملتا ہے کہ حیات سعدی اردو کے بہترین ادب میں گردانی جاتی ہے، مگر بعد میں اپنے جلیسوں اور ہم خیال احباب کے اصرار پر انہوں نے شعر العجم میں سعدی کو آخر شامل کر ہی لیا۔ اِسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی "حیات سعدی" کی تحقیق واسلوب اور تنقید وغیرہ سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے تھے۔

"یادگار غالب" حالی کی دوسری یادگار سوانح عمری ہے، جو 1896ء میں مکمل ہوئی اور ایک سال بعد 1897ء میں نامی پریس کانپور سے پہلی بار اشاعت پذیر ہوئی۔ جب یہ کتاب منظر عام پر آئی، تو اس وقت سرسید احمد خان زندہ تھے اور یقیناً حالی نے غالب سے متعلق معلومات وغیرہ کے لیے ان سے بھی مدد اور استفادہ کیا ہوگا۔ پہلے بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ اردو میں سوانح عمری کی باقاعدہ ابتدا حالی نے کی تھی، مگر ان سے قبل چھپنے والے شعرا کرام کے مجمل تذکروں اور تبصروں میں کچھ نہ کچھ حد تک سوانح عمری کا سُرمہ ملتا ہے، جن سے حالی نے بھرپور علمی، تحقیقی وتنقیدی فائدہ اٹھایا ہے، اِن مختصر تین تذکروں میں عمدۂ منتخبہ (مولفہ، اعظم الدولہ سرور 1812ء) عیار الشعرا (مولفہ، خوب چند ذکا 1833ء) اور گلشن بے خار (مولفہ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ 1835ء) شامل ہیں، علاوہ ازیں دیوان غالب (اشاعت اول اکتوبر 1841ء) پر نواب ضیاالدین احمد خاں نیر و رخشاں کی تقریظ اور سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" (1847ء) کے چوتھے باب میں غالب کی مختصر سوانح اور ان کے فنی محاسن پر تحریریں چھپ چکی تھیں، یہ سب کچھ "یادگار غالب" لکھنے کے لیے سود مند ثابت ہوئیں۔ محمد حسین آزاد کی "آب حیات" (1880ء) بھی شائع ہو چکی تھی، اس میں انہوں نے پسندیدگی کی حد تک یا شاید غالب کی مخالفت میں شاعرانہ عظمت کا تاج غالب کی بجائے ذوق کے سر پر رکھ کر تنقیدی وتنقیصی بحث ومباحثے کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ حالی کی حین حیات میں ہو چکا تھا۔ غالب کی سوانح عمری کے حوالے سے غالب کے مکاتیب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ محققین کی یہی متفقہ رائے ہے کہ غالب نے 1848ء سے اردو میں خطوط لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ اردو میں لکھے گئے ان کے خطوط کے دو مجموعے "عود ہندی" (1868ء) اور "اردوئے معلیٰ" (1869ء) شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ اپنے خطوط سے متعلق خود لکھتے ہیں کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ اس وقت ان کی شاعری کی مشکل پسندی کی وجہ سے اپنی حین حیات بطور شاعر مقبولیت حاصل نہ کر سکے تھے، البتہ مکتوب نگاری کے طرز اسلوب، شگفتگی، برجستگی اور بزلہ سنجی کے سبب انہیں شہرت اور پذیری حاصل ہو چکی تھی۔

غالب کے مکاتیب نے بھی "یاد گار غالب" لکھنے میں حالی کی کافی مدد کی تھی۔ محققین اپنی اپنی تحریروں میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" کی اشاعت سے یہ فائدہ ہوا کہ حالی نے ردِ عمل کے طور پر "یاد گار غالب" لکھ ڈالی، مگر ہمارے خیال میں مولانا حالی کے پیش نظر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اِس قسم کی سوچ اور رویہ حالی کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ غالب کے شاگرد ہونے کے ناتے حالی کا یہ فرض بھی تھا اور قرض بھی، کہ وہ اپنے استاد کی سوانح حیات اور ان کے شاعرانہ و نثری محاسن پر تنقید و تحقیق کا در کھول کر حق ادا کریں۔ انہوں نے شاعری اور انشا پردازی سے ہٹ کر غالب کی شخصیت سے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے، اس میں حالی نے بڑی فکر اور احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا۔ غالب اگر غالب ثابت ہوا، تو اپنی شاعری اور انشا پردازی کے طفیل! ورنہ ان اصناف سے ہٹ کر غالب کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ خود حالی بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں۔ وہ "یاد گار غالب" کے دیباچے میں بر ملا لکھتے ہیں کہ:-

> "اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا، مگر صرف اِسی ایک کام نے ان کی لائف کو دارالخلامہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔"(۲۰)

"یاد گار غالب" دو احاطوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں حالاتِ زندگی، زندگی کے معمولات، لطائف و واقعات وغیرہ، جب کہ دوسرا حصہ غالب کی شاعری پر تنقیدی جائزہ اور کچھ انتخاب پر مشتمل ہے۔ غالب کی زندگی میں جہاں جہاں فروگزاشتیں پائی جاتی تھیں، یا جن واقعات کے لکھنے سے غالب کی شخصیت متاثر ہونے کا اندیشہ تھا، انہیں حالی نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ خود سے تحقیق نہ کر کے صرف غالب پر اکتفا کرتے ہوئے بہت سی باتیں بھی حقائق سے ہٹ کر "یاد گار غالب" کا حصہ بن گئی ہیں، اُن میں ان گنت خامیاں بھی رہ گئی ہیں۔ اِن راہ پا جانے والی کمزوریوں کا دفاع کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ "اس میں کئی خامیاں ہیں، لیکن ابھی تک کوئی تبصرہ ایسا شائع نہیں ہوا، جس میں اس سے کم خامیاں ہوں۔۔۔۔ جہاں کہیں انہیں اپنے استاد کا پلہ کمزور نظر آیا، دلائل کی کمی کو انشا پردازی کے زور سے پورا کیا" اس کے باوجود یہ کتاب غالب کی شخصیت اور فنی محاسن کو احاطہ کرنے میں بنیاد فراہم کرتی ہے۔ "یاد گار غالب" میں غالب کی شگفتگی اور بزلہ سنجی کا تصور ابھرتا ہے، جو حالی کی انشا پردازی پر دلالت کرتا ہے، اس لیے یہ کتاب حالی کی لکھی ہوئی تمام کتب پر طرز اسلوب اور تنقید میں سبقت لے گئی ہے، اس پر بعض ناقدین نے کھل کر مخالفت بھی کی ہے، ان میں سے غلام رسول مہر کی یہ رائے تھی کہ "یاد گار اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کی مفصل اور مستند سرگزشت نہیں"۔ مولانا مہر کی بقول خاصے "یہ کوئی تعجب انگیز تنقیصی رائے نہیں" ہمارے خیال میں اِس قسم کی لکھی جانے والی کسی بھی کتاب سے متعلق ایسی رائے قائم کی جا سکتی ہے، ایسی تنقید نہایت آسان اور جچی تلی ہوتی ہے۔ کوئی کتاب حرف آخر تک نہیں پہنچ سکتی، وہ ان گنت خوبیوں اور دو چار خامیوں کا احساس ضرور دلاتی ہے۔

مولانا حالی نے اپنی خود نوشت میں سر سید احمد خان سے راہ و رسم کی ابتدا کا ذکر کیا ہے۔ بقول حالی، نواب مصطفٰے خان، شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی صحبت میں ان کا طبعی میلان چمکا۔ نواب شیفتہ سائنٹفک سوسائٹی کے متحرک اور اہم رکن تھے۔ وہ سائنٹیفک کے تیسرے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے، تو مولانا حالی کو وہ اپنے ہم راہ لے گئے، جہاں حالی نے پہلی بار سر سید کو دیکھا اور ملاقات ہوئی۔ یہی سے اُن کے تعلق کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کا رابطہ رسم گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ سر سید کا فکری اور تحریکی اثر قبول کر رہے تھے، جو ان کی زندگی کے آخری لمحات تک قائم دائم رہا، خود سر سید بھی جو حالی سے عمر میں بیس سال بڑے تھے، وہ اُن سے حد درجہ توقعات رکھتے تھے۔ سر سید اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں اِس توقع کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ:-

> "مولوی الطاف حسین اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر سے رشتہ تعلق پنجاب کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے۔ ان کی مثنوی حب وطن اور مثنوی مناظرہ رحم و انصاف جو پنجابی اخبار میں چھپی ہیں، در حقیقت علم و ادب میں ایک کارنامہ ہے، اگر ہماری قوم اِس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ رہے اور مضامین عشقیہ اور مضامین خیالیہ اور مضامین نیچر میں جو فرق ہے، اس کو دل میں بٹھالے تو اِن بزرگوں کے سبب ہماری قوم کا لٹریچر کیسا عمدہ ہو جائے گا، اور وہ دِن ضرور آوے گا کہ ہم بھی اپنی قوم کے کسی نہ کسی شاعر پر ایسا ہی فخر کریں گے، جیسا لوگ ملٹن اور شیکسپیئر پر ناز کرتے ہیں۔"(۲۱)

جب حالی "حیات جاوید" لکھ رہے تھے، اور یقیناً لکھنے کے اِن ابتدائی ایام میں سر سید سے حالی نے ذکر کیا ہو گا، تو اس موقع پر سر سید فرماتے ہیں کہ:

> "میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔"(۲۲)

یہ تو سر سید احمد خان ایسی قد آور شخصیت کی عاجزی تھی، جس میں بچپن اور جوانی کے مشاغل اور "دین داروں" کے رویوں پر بے باکانہ طنز ہے، بہر حال حالی "حیات جاوید" کی تکمیل کے لیے کمربستہ ہوگئے، انہوں نے اِس مقصد کے لیے 1894ء میں علی گڑھ میں قیام اختیار کیا۔ دیدہ ریزی اور جانفشانی سے تمام ماخذات سے سب کچھ حاصل کیا، جو ناگزیر تھیں۔"حیات جاوید" دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا حصہ سر سید کی زندگی کے حالات و واقعات پر ہیں، جب کہ دوسرا حصہ ان کے علمی، فنی، سیاسی، تعلیمی اور سماجی وغیرہ کارناموں کو احاطہ نقد و نظر میں لایا گیا ہے۔"حیات جاوید" میں بسا مقامات پر صاحب الرائے کا اختلاف ان کی اپنی عقل، سمجھ بوجھ اور علم کے موافق موجود ہے۔ کتاب پر سب سے بڑا اعتراض واختلاف یہ پایا جاتا ہے کہ اس میں ہیرو کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، ان کی کمزوریاں نہیں دکھائی گئیں۔ اِن نکتہ چینیوں اور اعتراض سے قبل ہی حالی نے "حیات جاوید" کے دیباچے میں یہ واضح کردیا تھا کہ:۔

> "ہم میں وہ (سر سید) پہلا شخص ہے، جس میں مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے، اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔"
>
> (۲۳)

ہو سکتا ہے کہ حالی کو سر سید سے بعض معاملات میں اختلاف ہو، جس کا انہوں نے اظہار "حیات جاوید" میں نہیں کیا۔ یہ بھی حالی کا اعلیٰ حسن ظن ہے، جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ سر سید کی نیت پر شک نہیں کرتے تھے، نہ ہی کسی اور قسم کی بدگمانی ان کے متعلق دِل میں رکھتے تھے، حیرت ہے کہ حالی کی اتنی صاف بات لکھے جانے کے باوجود بھی مولانا شبلی نے "حیات جاوید" کو "مدلل مداحی، کتاب المناقب، یک رخی تصویر" قرار دے کر تنقیصی روشنی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ کچھ ناقدین نے اِسے "شبلی حالی چشمک" اور بعض "شبلی سر سید چشمک" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، مگر ہمارے خیال میں دونوں صورتیں درست نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شبلی کو بعض معاملات میں سر سید سے اختلاف ہو، جسے حالی نے "حیات جاوید" میں تحسینی اور ستائشی نظر سے دیکھا ہو، بہر حال سر سید کے قریبی رفقا ہونے کی وجہ سے حالی اور شبلی اپنا اپنا نقطہ نظر رکھتے تھے، اور دونوں کی نیتوں اور نظریے پر ہرگز شک نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں جانب داری اور رعایت لفظی کا تصور لے لینا فرض کے زمرے میں آتا ہے۔ حالی سے قبل سر سید کی سوانح پر کرنل گریہم اور منشی سراج الدین احمد بھی کام کر چکے ہیں، مگر اُن سے کہیں زیادہ معلومات مولانا حالی نے تحقیق و فکر اور بڑی عرق ریزی سے اکٹھی کرکے "حیات جاوید" کا حصہ بنایا ہے، حالی کی کتاب کے بعد محولہ بالا دونوں مصنفین کا کام دب کر رہ گیا ہے۔ کتاب کم و بیش ہزار صفحات میں ہے، اور اس کی یہی ضخامت بعضوں کے خیال میں ایک عیب ہے، مگر کسی بھی اچھی کتاب کی ضخامت اس وقت عیب تصور ہوتی ہے، جب اس میں غیر ضروری مواد شامل ہو جائے، مگر "حیات جاوید" کو غیر ضروری طور پر عیب قرار دینا بھی ہماری نظر میں بڑا عیب ہے۔ کتاب میں بسا مقامات پر اگر جذباتی طرز اسلوب محسوس ہوتا ہے، تو یہ بھی کوئی عیب ہے نہ ہی طرف داری۔

ماخذو مراجع:

1. ڈاکٹر سید عبداللہ، شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر و قیمت، مشمولہ مقالاتِ یوم شبلی، اردو مرکز لاہور بار اول 1961ء، ص1
2. جیلانی کامران، حالی اور مسدس مدوجزر اسلام، مشمولہ ششماہی صحیفہ، مجلس ترقی ادب لاہور جنوری 2015ء تا جون 2015ء، ص23
3. سرراس مسعود، خواجہ حالی کی دو تصویریں، مشمولہ ششماہی صحیفہ، مجلس ترقی ادب لاہور جنوری 2015ء، ص23
4. مکتوبات سر سید، مجلس ترقی ادب لاہور، ماہ جون 1959ء، ص309
5. ششماہی صحیفہ (حالی نمبر) مجلس ترقی ادب لاہور جنوری 2015ء تا جون 2015ء، ص317
6. اصغر عباس، حالی اور سر سید (حالی نمبر)، ص86
7. سرراس مسعود، خواجہ حالی کی دو تصویریں، مشمولہ صحیفہ (حالی نمبر)، ص23
8. صحیفہ (حالی نمبر)
9. ایضاً
10. مکتوبات سر سید، ص309
11. ایضاً
12. ایضاً

13. الطاف حسین حالی، خود نوشت سوانح حیات، مشمولہ معارف مئی 1927ء
14. ایضاً
15. ایضاً
16. سید عبداللہ، حالی بحیثیت سوانح نگار، مشمولہ صحیفہ (حالی نمبر)
17. الطاف حسین حالی، خود نوشت سوانح حیات، مشمولہ معارف مئی 1927ء
18. الطاف حسین حالی، حیات سعدی، مکتبہ عالیہ لاہور، 1987ء، ص 191
19. سید عبداللہ، حالی بحیثیت سوانح نگار، مشمولہ صحیفہ ص 130
20. الطاف حسین حالی، یادگار غالب
21. تہذیب الاخلاق، 1283 ہجری
22. صحیفہ (حالی نمبر) ص 125
23. دیباچہ، حیات جاوید